''اپنے آپ کو معاف کر دیا کیجیئے''

فیض صاحب کے سیاسی مسلک سے لوگوں کو اختلاف رہا ہے اور میں بھی ان ہی میں سے ہوں۔ لیکن آزادی، احترامِ آدمیت اور انسانی اقدار کی پاسداری جس پامردی اور استقامت سے انھوں نے کی وہ لائقِ تحسین و تکریم ہے۔ جس مسلکِ کج کلاہی کی سمت انھوں نے ایک دفعہ اپنا قبلہ دُرست کر لیا پھر اُسے تا عمر نہیں بدلا اور اپنے اسی عہدِ وفا میں علاجِ گردشِ لیل و نہار ڈھونڈا۔ اور انھوں نے یہ اُس زمانے میں کیا جب مصلحت کدہ میں ایسے لکھنے والوں کا سکہ چلتا تھا جو ہر کھیل کے بعد اپنا ''اینٹنا'' کا رُخ بدلتے رہے تھے۔ بلکہ بعضے تو دوسرے کے ''اینٹنا'' میں اپنا تار جوڑ کے ''تماشائے اہلِ قلم دیکھتے ہیں۔'' کتنے ایسے ہیں جو نصف صدی تک ایک ہی وضع پر قائم رہے ہوں؟ بدلتی رُت کے ساتھیوں نے وفاداریاں بدلیں، مسلک بدلے۔ کچھ دُکھیاروں پر تو ایسا بجوگ پڑا کہ انھوں نے مارے ڈر کے فقط مشرب ہی نہیں بدلا، مشروب بھی بدل دیا۔ یعنی سادہ پانی پی پی کے بہکنے اور لڑکھڑانے لگے۔ برگزیدگی کی تلاش میں نکلے تھے صرف گزیدگی ہاتھ لگی۔ ان کا ضمیر تو کیا صاف ہو گا، ان بے چاروں کا تو مافی الضمیر تک صاف نہیں۔

فیض صاحب سے میری پہلی ملاقات چھ سال پہلے مخدومی ماجد علی صاحب کے یہاں ہوئی۔ بہت سے نیاز مند فیض صاحب کا حلقہ کیے بیٹھے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ کسی نے فیض صاحب سے میرا تعارف کرایا یا نہیں۔ بہر حال میں دو گھنٹے تک حسبِ معمول و موقع، خاموش بیٹھا مزے مزے کی باتوں سے محظوظ ہوتا رہا۔ دوسرے دن علی

الصبح عزیز گرامی افتخار عارف کا فون آیا کہ فیض صاحب آپ کے یہاں آج کسی وقت آنا چاہتے ہیں۔ ہوا یہ کہ آپ کے جانے کے بعد انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ وہ صاحب جو اپنی بیگم کے پہلو میں سر نہوڑائے، گم صم بیٹھے تھے وہ کون تھے؟ میں نے انھیں بتایا کہ وہ یوسفی صاحب تھے اور یہ ان کا نارمل پوز اور پڑوس ہے۔ فیض صاحب کہنے لگے ''تم نے تعارف کیوں نہیں کرایا؟'' میں نے کہا میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ یوسفی صاحب سے کبھی نہیں ملے۔ کہنے لگے '' ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔ مجھے بڑی ندامت ہے۔ صبح ہی مجھے لے چلو۔''

میں نے افتخار عارف سے کہا ''فیض صاحب سے عرض کر دیجیے کہ آج شام عطار خود حاضرِ خدمت ہوکر اپنے مشک کا تعارف کروا دے گا۔'' جائے واردات وہی مرجع خلائق ماجد علی صاحب کا دولت کدہ۔ شام کو ملاقات ہوئی تو فیض صاحب اتنے محجوب تھے کہ مجھے خود اپنے آپ سے شرم آنے لگی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ خود کو اس کوتاہی پر بھی قصوروار ٹھیرا رہے ہیں کہ میری اور ان کی ملاقات پندرہ بیس سال پہلے کیوں نہ ہوئی! فیض صاحب کے اس انکسار اور حسنِ اخلاق سے میں اس لیے اور بھی متاثر ہوا کہ مجھے نہ جانے کیوں اب بھی یقین ہے کہ اُس وقت تک انھوں نے میری کوئی تحریر نہیں پڑھی تھی۔ سنی سنائی تعریف پر ایمان لے آئے تھے۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ وہ کم سخن تھے اور میں حسبِ معمول اپنے خول میں بند۔ اور جب دونوں بزرگ فریق شرمیلے واقع ہوں تو برخوردار افتخار کا طوطی اگر بولے نہیں تو کیا کرے۔

بعض باتیں ایسی ہیں جو فیض صاحب کے مزاج اور مسلک کے خلاف تھیں۔ مثلاً انھیں کبھی روپے کا ذکر کرتے نہیں سنا۔ اپنی کسی ضرورت کا ذکر کرتے نہیں سنا۔ زمانے کی شکایت یا اپنے سیاسی مسلک کے بارے میں نثر میں کبھی گفتگو کرتے ہوئے نہیں سنا۔ کسی کی غیبت یا برائی نہیں سن سکتے تھے۔ کوئی ان کے سامنے ادبدا کر کسی کہ ذکر بہ بدی کرتا تو وہ اپنا ذہن، زبان اور کان سب سوئچ آف کر دیتے تھے۔ ایک دفعہ مجھ سے پوچھا ''آج کل کچھ لکھ رہے ہیں یا بینک کے کام سے فرصت نہیں ملتی؟'' میں نے کہا '' فرصت اور فراغت تو بہت ہے مگر کاہل ہوگیا ہوں۔ پتا

نہیں مارا جاتا۔ مطالعے کی عیاشیوں میں پڑ گیا ہوں اور جب کسی لکھنے والے کو پڑھنے میں زیادہ مزا آنے لگے تو سمجھئے حرام خوری پر اُتر آیا ہے۔'' میں بہت دیر تک خود کو اسی طرح برا بھلا کہتا رہا۔ فیض صاحب خاموش سنتے رہے۔ پھر شفقت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اتنے نزدیک آ گئے کہ ان کی سگریٹ کی راکھ میری ٹائی پر گرنے لگی۔ کہنے لگے ''بھئی ہم کسی کی غیبت نہیں سن سکتے۔ کسی سے کینہ رکھنا اچھا نہیں۔ اپنے آپ کو معاف کر دیا کیجیے۔ درگذر ثواب کا کام ہے۔''

(''مطالعۂ فیض ۔ یورپ میں''مولف: اشفاق حسین)